Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 36, Sr.No.99, 2015, pp 23 - 44

مجلہ تحقیق
مجلہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۶، اپریل۔جون ۲۰۱۵ء، شمارہ ۹۹

جلال آلِ احمد

جدید فارسی ادب کا ایک درخشندہ ستارہ

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود☆

Abstract:

Persian literature was influenced by Russian revolution and Iranian poets and writers were also deeply influenced by communist writer. Jalal Al-e-Ahmad is one of the prominent writers of 20th century in Iran. He wrote several novels and short stories which have been introduced and evaulated in this article.

Key Words: Persian literature, 20th Century, Iranian writers, Jalal Al-e-Ahmad.

ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصے پر محیط فارسی افسانے کے سفر میں اہم موڑ اُس وقت آیا جب بیسویں صدی کے ربع دوم میں فرانسیسی زبان جاننے اور جدید یورپی ادبی رجحانات سے خاطر خواہ آشنائی رکھنے والے نوجوانوں کی تخلیقات ایران کے معروف ادبی مجلوں میں کثرت اور تواتر سے شایع ہونا شروع ہوئیں۔ انقلابِ روس (۱۹۱۷ء) اور بعد ازاں دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹۔۱۹۴۵ء) کے نتیجے میں رونما ہونے والی سیاسی وسماجی تبدیلیوں نے ایرانی ادیب کے ذہن کو بھی خاصا متاثر کیا جس کا رنگ اس کی تحریروں میں بجا طور پر جھلکنے لگا۔ جدید ایرانی افسانہ نگاروں کی پہلی کھیپ میں شامل ادیبوں

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مثلاً عباس خلیلی، جہانگیر جلیلی، سعید نفیسی، علی دشتی، محمد حجازی اور محمد علی جمالزادہ وغیرہ نے آسان اور سادہ زبان استعمال کرتے ہوئے اپنی بیشتر توجہ عام معاشرتی مسائل کو ادب کا حصہ بنانے پر مرکوز رکھی [۱] تاہم دوسری کھیپ نے تخلیق ادب کے ساتھ ساتھ عملی سیاست نیز افسانے کے علاوہ دیگر اصنافِ نثر کو بھی ذریعۂ اظہار بناتے ہوئے جدید فارسی ادب کا دامن وسیع تر کر دیا۔ جلال آلِ احمد جدید فارسی افسانے کی تاریخ میں اسی گروہ کے سرخیل شمار ہوتے ہیں جن کی تخلیقات کا دائرہ افسانہ نگاری سے لے کر تراجم، تنقید، سفرنامے، ناول نگاری، اخبار نویسی، اور عمومی مضمون نگاری تک پھیلا ہوا ہے۔ تقریباً چھیالیس برس کی عمر میں پراسرار انداز میں وفات پا جانے والے اس عظیم ایرانی ادیب کو ایک بڑا تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محبِّ وطن سیاسی و سماجی دانشور ہونے کا مرتبہ بھی حاصل ہے۔

۲ دسمبر ۱۹۲۳ء کو تہران کے ایک مذہبی گھرانے میں جنم لینے والے جلال آلِ احمد کی ساری زندگی جدوجہد سے عبارت رہی۔ ایران کے معروف مذہبی گھرانے میں سات بہنوں اور ایک بھائی کے بعد پیدا ہونے والے اپنے اس بیٹے کو اس کے والد سید آلِ احمد [۲] ابتدائی مذہبی تعلیم کے بعد تجارت کے پیشے سے منسلک کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اوائل نوجوانی میں گھڑی سازی، چرم فروشی اور الیکٹریشن جیسے پیشے اپنائے تاہم ادبیات سے فطری دلچسپی کی بنا پر ''دارالفنون'' [۳] کی ایوننگ کلاسز میں تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ۱۹۴۶ء میں دانشکدۂ ادبیات (دانشگاہ تہران) سے ادبیات میں گریجوایشن مکمل کی۔ مزید تعلیم جاری نہ رکھنے یا نہ رکھ سکنے کے بارے میں جلال کی اپنی رائے بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''خدا وسوسۂ پی اچ دی رادر دلِ من کُشت تا برای ادبیات زنده مانم۔'' [امختار مسعود ۲۰۱۱: ۴۵۵]
>
> ترجمہ: ''خدا نے میرے دل سے پی ایچ ڈی کی خواہش کی ختم کر دی تا کہ میں ادب (تخلیق کرنے) کے لئے زندہ رہوں۔''

اسی طرح ایک اور جگہ پر اس بات کو یوں بھی کہا:

''ازان بیماری (دکتر شدن) شفا یافت۔'' [شمس ۱۳۶۹:۴۱۹]

گریجوایشن کے ایک سال بعد ہی وہ وہ معلّمی کے پیشے سے منسلک ہو گئے اور باقی تمام عمر بطور ادیب عزت وشہرت پانے کے باوجود انھوں نے معلّمی ترک نہ کی۔اس کی بڑی وجہ محض قلم سے کمائی ہوئی روزی کا گذر بسر کے لئے ناکافی ہونا تھا۔

جلال آلِ احمد کے ادبی وسیاسی کیریئر کا آغاز تقریباً ایک ساتھ ہوا۔ایران کے بلند پایہ ادبی رسالے ''سخن'' [۴] میں اُن کا پہلا افسانہ ۱۹۴۵ء میں شایع ہوا۔اس سے ایک برس قبل ۱۹۴۴ء میں وہ ''حزبِ تودہ'' یعنی کمیونسٹ پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر چکے تھے۔سیاست اور ادب کا یہ ساتھ زیادہ دیر تک نبھ نہ سکا اور اور جلال نے ۱۹۴۸ء میں حزبِ تودہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔تاہم اس وقت تک وہ ایک نمایاں ادیب کے طور پر معروف ہو چکے تھے۔

ایک بھرپور ادبی زندگی گزارتے ہوئے ۹ ستمبر ۱۹۶۹ء کی صبح وہ اسالم (گیلان) میں واقع اپنے مکان میں بظاہر ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں مردہ پائے گئے۔جلال کی ناگہاں موت ایک سربستہ راز ہے جس پر وقوعہ کے روز سے ہی شکوک کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ ساواکی ایجنٹوں نے انھیں زہر خورانی سے ہلاک کیا۔

ازدواجی زندگی

بیسویں صدی میں ایرانی ادیبوں، بالخصوص افسانہ نگاروں، کی باہم شادیاں بھی معاصر تاریخ ادب کا دلچسپ موضوع ہیں۔جلال آلِ احمد اور سیمین دانشور [۵] کے علاوہ اس حوالے سے جمال میر صادقی اور میمنت میر صادقی ذوالقدر (تاریخ ازدواج: ۱۹۵۱ء) اور ہوشنگ گلشیری اور فرزانہ طاہری (تاریخ ازدواج: ۱۹۷۹ء) کے نام اہم ہیں۔

۱۹۵۰ء میں سیمین دانشور (۱۹۲۳۔۲۰۱۲ء) سے شادی جلال کی زندگی میں ایک خوش آیند موڑ ثابت ہوئی۔ذوق، خیالات، ترجیحات، میلانات غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں مکمل ہم آہنگی نے دونوں ابھرتے ہوئے ادیبوں کے اس ازدواجی تعلق کو ایک ایسی یادگار رفاقت میں بدلا جو بالآخر ۱۹۶۹ء میں جلال کی وفات پر اپنے اختتام کو پہنچی۔جلال کی شخصیت کے حوالے سے سیمین دانشور کی تحریریں **شوہرِ من جلال** اور **غروبِ جلال** خاصی اہم ہیں۔

تقریباً انیس برس پر محیط ازدواجی زندگی میں جلال کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور مشرقی معاشروں میں رائج روایتی قدامت پرستی پر مبنی اوہام کے حوالے سے انہیں بعض اوقات طنز وتنقید بھی سہنا پڑی۔

سیاسی سرگرمیاں

''حزبِ تودہ'' سے وابستگی کے تھوڑے عرصہ بعد ہی جلال کو پارٹی کمیٹی برائے تہران کا رکن بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پارٹی کے ترجمان اور شعبہ نشر و اشاعت کے نگران بھی مقرر ہوئے۔ تاہم اس سیاسی پارٹی سے ان کی حد درجہ فعال وابستگی ۱۹۴۸ء میں اس وقت اختتام کو پہنچی جب ۱۹۴۷ء میں سوویت روس کی جانب سے آذر بائیجان پر قبضے پر احتجاج کرتے ہوئے وہ خلیل ملکی [۶] اور دوسرے متعدد دانشوروں کے ہمراہ ''حزبِ تودہ'' سے الگ ہوگئے اور پھر کافی عرصہ عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کئے رکھی۔

۱۹۵۰ء میں جلال ایک بار پھر کوچۂ سیاست میں وارد ہوئے اور نامور ایرانی وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق (۱۸۸۲۔۱۹۶۷ء) کی رہنمائی میں چلنے والی ''نہضتِ ملی شدنِ نفت'' (تیل کی صنعت قومیانے کی تحریک) کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے ''حزبِ زحمت کشانِ ملتِ ایران'' میں شمولیت اختیار کر لی۔ زود رنجی اور تلون مزاجی نے یہاں بھی رنگ دکھایا اور جلال نے ''حزبِ زحمت کشان'' کے ناراض ارکان سے مل کر ''نیروی سوم'' (تیسری قوت) نامی ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اس حیثیت میں جلال **نیروی سوم، علم و زندگی** اور دیگر عناوین کے تحت شایع ہونے والی پارٹی مطبوعات کے مدیر بھی رہے۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں سی آئی اے کی حمایت سے وقوع پذیر ہونے والے ''انقلاب'' کے بعد انھیں کچھ عرصہ جیل بھی بھگتنا پڑی۔

سیاسی طور پر جلال کا آئیڈیل ایران میں ایک حقیقی طور پر آزاد، خود مختار اور محبِ وطن حکومت کا قیام تھا۔ وہ اپنی وفات کے تقریباً دس برس بعد رونما ہونے والے ''انقلابِ اسلامی ایران'' کے فکری معماروں میں شمار ہوتے ہیں۔ متعدد سیاسی و مذہبی رہنماؤں مثلاً آیت اللہ خمینی، سید علی خامنہ ای، سید احمد طالقانی، علی شریعتی اور مہدی بازرگان وغیرہ نے بھی جلال کی تحریروں کو سراہا ہے۔ [شمس ۱۹۶۹: ۵۲۵۔۵۳۸]

جلال کی دلچسپ شخصیت

ادب، سیاست، تدریس اور معاشرتی تنقید جیسے متنوع پہلوؤں سے عبارت مختصر زندگی گزارنے والے جلال آلِ احمد کی ذاتی زندگی بھی خاصی دلچسپ تھی جس کے بعض گوشوں پر نظر ڈالنا ان کی تحریروں کو سمجھنے میں بڑا معاون ہوسکتا ہے۔

پیدائشی طور پر جلال بائیں ہاتھ سے لکھتے تھے تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ سے لکھنے کی بھی مشق کر لی تھی۔ اگر چہ چھوٹی ٹائپ رائٹر خرید لینے کے بعد بیشتر کام اسی پر کرتے تاہم اکثر تحریروں کا پہلا ڈرافٹ قلم ہی سے کاغذ پر لکھتے۔ طالب علمی کے زمانے میں جلال نے خطاطی اور مصوری کی کلاسز میں بھی شرکت کی تھی۔

بعض دیگر بڑے ادیبوں کی طرح جلال بھی اشاعت سے قبل اپنی تحریریں منتخب دوستوں کو بھجوا کر ان کی رائے طلب کرتے اور ان تجاویز کی روشنی میں قابل قبول ترامیم کے بعد ہی وہ تحریر حتمی صورت میں کسی مجلّے یا پبلشر کو بغرض اشاعت بھجوائی جاتی۔ ان قریبی دوستوں میں جلال کے اساتذہ ،سینئر ہم عصر اور اور قریبی احباب مثلاً پرویز ناتل خانلری (۱۹۱۹۔۱۹۹۰ء)، صادق ہدایت (۱۹۰۳۔ ۱۹۵۱ء)، خلیل ملکی (۱۹۰۱۔۱۹۶۹ء)، ابراہیم گلستان (پیدائش: ۱۹۲۲ء)، غلام حسین ساعدی (۱۹۳۵ ۔۱۹۸۵ء) اور پرویز داریوش (۹۲۲۔۱۹۹۰ء) کے نام اہم ہیں۔

مختلف فنون لطیفہ سے جلال کے ربط نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ جلال کو فن تعمیر سے بھی خاصی دلچسپی تھی اور انھوں نے اسالم (گیلان) میں واقع اپنے گھر کا نقشہ بھی خود ہی بنایا تھا۔ اسی طرح ان کے پاس ایک عجیب وغریب طرح کا ہیٹر تھا جس کے خالق وہ خود ہی تھے۔

[صافی ۱۳۶۴: ۵۵۔۵۶]

تلون مزاجی کے ساتھ ساتھ حد درجہ صاف گوئی جلال کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو ہے۔ اس حوالے سے ایک واقعے کا ذکر ضروری ہے۔ جلال کچھ عرصہ ''دانش سرای عالی'' (موجودہ ''دانشگاہ تربیت مدرس'') میں تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ ایک مشفق اور ہر دلعزیز استاد کے طور پر ان کی زندگی کا یہ دور بھی نہایت یادگار رہا۔ وہ اپنے طالبعلموں سے، جو دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے سکول ٹیچرز ہوتے تھے، گھل مل کر اور ان کی ذہنی سطح پر آ کر بات کرتے۔ ان سے رابطہ کرنا قطعاً دشوار نہ تھا۔ وہ نہ صرف اپنی تحریروں کے حوالے سے متنازعہ نکات کے بارے میں چبھتے ہوئے سوالا ت کا جواب بھی نہایت تحمل سے دیتے بلکہ سوال کرنے والے کی خوب حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ ایک مرتبہ کسی طالبعلم نے اپنے سوال کا تسلی بخش جواب نہ پا کر ایک دلچسپ حرکت کی کہ اپنا سوال اور جلال کا جواب دونوں ایک کاغذ پر لکھ لئے اور تھوڑی دیر بعد اجازت طلب کی کہ وہ اپنی ایک تحریر کلاس میں پڑھنا چاہتا ہے۔ جلال نے حسب معمول بخوشی اجازت دے دی۔ تاہم اپنے جواب میں موجود غلطی

کا احساس کر کے نہ صرف اس طالب علم کا شکریہ ادا کیا بلکہ امتحان میں اسے اضافی نمبر بھی دیے۔

[۱۳۶۴۔۶۶]

جلال پر منشیات استعمال کرنے کا الزام بھی لگا جس کی ان کے بھائی اور سوانح نگار شمس آلِ احمد نے بھرپور تردید کی ہے۔ ان کے بقول جلال کی سگریٹ نوشی کی عادت آخری دم تک برقرار رہی تاہم افیون کے استعمال اور ''دایم الخمر'' جیسے الزامات میں کوئی صداقت نہیں۔

[شمس ۱۳۶۹: ۳۴۷۔۳۵۲]

نوجوان ادیبوں سے تبادلۂ خیال اور ان کی فکری اور فنی تربیت بھی جلال کی شخصیت کا ایک ناقابل فراموش پہلو ہے۔ زندگی کے آخری دس برس وہ ہفتے میں ایک بار ''رستورانِ چہار فصل'' میں ضرور تشریف لاتے جہاں ان کا اپنے ہمعصروں اور نئے لکھنے والوں سے ادبی و دیگر معاملات پر خوب مکالمہ رہتا۔

جلال اپنی تحریروں میں جیسے حساس، تیز بین، جذباتی، خشمگین، جزئیات پر نظر رکھنے والے اور ظالم کو پچھاڑنے کی کوشش کرنے والے نظر آتے ہیں، اصل زندگی میں بھی ویسے ہی تھے۔ قلم کی حرمت کے بارے میں ان کے خیالات بڑے واضح ہیں۔ اپنے افسانوی مجموعے **زن زیادی** کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اگر می فروشی همان به که بازوی خود را... اما قلم هر گز!''

ترجمہ: ''اگر بیچنا ہی ہے تو زورِ بازو بیچو، زورِ قلم ہرگز نہیں!''

اسلوبِ نثر نگاری

جلال آلِ احمد کے اسلوبِ نثر کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور: آغاز سے **زن زیادی** کی اشاعت تک

دوسرا دور: ۱۹۵۲ء سے جلال کی وفات تک

جلال کی نثر کا دورِ اول زیادہ تر کلیشے سے عبارت ہے۔ اگرچہ وہ اپنی تحریر میں طنز کا استعمال کرتے ہیں لیکن یہ طنز قاری پر اپنا بھرپور تاثر نہیں چھوڑتی۔ تاہم دوسرے دور میں وہ کلیشے سے دامن چھڑا کر اپنا اسلوب وضع کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں؛ بیان کے لئے نئی مثالیں تراشتے ہیں نیز لفظوں کی نئی تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دور میں ''ایجاز'' اپنے عروج پر ہے۔ علاوہ ازیں

قدیم فارسی نثر کے انداز کی جانب جھکاؤ بھی واضح نظر آتا ہے۔[دستغیب ۱۳۷۱:۲۴۱۔۲۴۶]

زبان کے بارے میں جلال کے خیالات بڑے واضح تھے۔ وہ زبان کے حوالے سے گرامر کی پابندیوں میں جکڑے رہنے اور پیچیدگیوں سے الجھنے کے بجائے معنی کی فوری اور سو فیصد ترسیل کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں قواعد کی ناروا پابندیاں نہ صرف زبان کی پیش رفت کو محدود کر کے اسے جامد بناتی ہیں بلکہ لکھنے یا بولنے والوں کی راہِ فکر کو بھی مسدود کر دیتی ہیں۔ قدیم اساتذہ مثلاً مجتبیٰ مینوی وغیرہ نے زبان کے حوالے سے جلال کی بڑی عیب جوئی کی ہے اور اسے بڑا نا مناسب جانا ہے۔[دستغیب ۱۳۷۱:۲۴۸] اس موضوع پر شروع ہونے والی بحث ایک قلمی مناظرے کی صورت اختیار کر گئی۔ اعتراض اور جواب کے بعد جواب الجواب تک کی نوبت آن پہنچی کیونکہ مجتبیٰ مینوی تو ''می شود'' کو **میشه** اور ''می رود'' کو **میره** بھی لکھنے کے خلاف تھے! جبکہ جلال کے الفاظ میں:

> **''من به ازای زبانم زنده ام. من در همه مورد جهان وطنی هستم جز در مورد زبان. زبان من فارسی است. من ازین دُمِ زمانه به مادرم بسته ام .''**[دستغیب ۱۳۷۱:۲۴۷]

با محاورہ اور بول چال کے نزدیک والی زبان جلال کے اسلوبِ نثر کی ایک اور اہم خوبی ہے۔ حسن کامشاد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "A distinctive feature in nearly all of Al-i Ahmad's fictional works is the abundant use of spoken forms, extending even to his descriptive passages; indeed, it is often hard to distinguish direct and indirect speech in his narrative." (Kamshad 1966:126

جلال آل احمد کی نثر کی اہم ترین خوبی ''اختصار'' ہے۔ وہ عموماً مختصر جملے لکھتے ہیں اور اکثر جملے کے اہم حصے یعنی فعل کو حذف کر کے تکمیلِ معنی کے لئے بات قاری کے ذہن کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قاسم صافی کے بقول:

> **''اگر دیگری می خواست مطالب ِ او را بنویسد ، صرفنظر از**

مایه داشتن و جوهرهٔ خاص ، دست کم حجم نوشتارش دو برابر می شد . "[صافی ۱۳۶۴:۵۱]

آلِ احمد کی نثر کی ایک اور اہم خصوصیت بڑے شہروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے قصبوں اور دور افتادہ علاقوں میں مستعمل الفاظ اور لہجوں کا استعمال ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایران کے دور افتادہ قصبات و دیہات میں مستعمل الفاظ و محاورات اور لہجوں کو اپنی تحریروں میں سمونے کی بھر پور کوشش کی تا کہ فارسی زبان کا دامن وسیع تر ہو نیز لغوی نقائص بھی رفع ہو جائیں۔ قاسم صافی راوی ہیں کہ جلال نے نہ صرف خود بلکہ اپنے طالبعلموں کی مدد سے مقامی محاورات پر اور لوک دانش پر مبنی حکایتوں کا خاصا ذخیرہ بھی جمع کر لیا تھا جسے وہ الگ سے مرتب کر کے شایع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر بوجوہ ایسا ممکن نہ ہو سکا اور بہ گمانِ غالب یہ لسانی سرمایہ ''دانشگاہ تربیت معلم'' (سابقہ ''دانش سرای عالی'') یا ان کے اپنے گھر کے کسی گوشے میں ''محفوظ'' پڑا ہوگا۔ [صافی ۱۳۶۴:۵۲] جلال کے اسلوب پر جامع ترین تبصرہ ان کے ہمعصر نقاد حسن کامشاد کا ہے:

> "All that is truly Persian in the form and substance of Jamalzadeh, Alvi and Hidayat- modern Persia's three leading writers- becomes a happy blend in Al-i Ahmad's writings." (Kamshad 1966:125)

افسانہ نگاری

اس امر میں کوئی دو رائے نہیں کہ متعدد اصنافِ نثر مثلاً ترجمہ، ناول نگاری، افسانہ نگاری اور مضمون نویسی وغیرہ میں ہنر آزمائی کرنے کے باوجود جلال کی پہلی ترجیح افسانہ نگاری ہی تھی جو اول و آخر ان کی پہچان ٹھہری۔ پانچ افسانوی مجموعوں میں شامل چالیس سے کچھ اُوپر افسانوں میں دس بارہ افسانے مثلاً شوهر آمریکائی ، دید و باز دید ، گلدانِ چینی ، سه تار ، جشنِ فرخنده ، دزد زده ، نزدیکِ مرزون آباد ، وداع ، افطارِ بی موقع، آفتابِ لبِ بام اور چند دیگر تو جدید فارسی ادب کا شاہکار مانے جاتے ہیں۔

افسانہ نگاری میں جلال کا اسلوب یورپ کے ریئلسٹ افسانہ نگاروں کے زیادہ قریب ہے۔ اس حوالے سے پہلے چار مجموعوں میں شامل افسانے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ساخت اور بنت کے لحاظ سے مغربی لیکن موضوعی لحاظ سے یہ افسانے ایرانی معاشرے کے مختلف طبقوں میں رواں

زندگی کی زیریں لہر کو بخوبی بیان کرتے ہیں۔

جلال کے افسانوں کے بیشتر کردار متوسط درجے کی زندگی گزارنے والے بڑے شہروں کے باسی ہیں۔ کانچ کا نیا گلدان خرید کر بس میں سوار ہونے والا مسافر (گلدانِ چینی) دوسری شادی ہو جانے پر پچھلے خاوند سے پیدا ہونے والے بچے سے پیچھا چھڑانے پر مجبور ماں (بچہ مُردم)، نفسیاتی طور پر بیمار ہو کر مختلف ڈاکٹروں کے ہاں چکر لگانے والا معمولی تنخواہ دار (مسلول)، پائی پائی جوڑ کر نیا ساز خریدنے والا غریب فنکار (سہ تار) یا مسافروں کو پھول بیچ کر رقم پکڑتے ہوئے ٹرین تلے آ کر کچلی جانے والی غریب بچی (وداع)؛ یہی وہ عام لوگ ہیں جو صورت بدل بدل کر جلال کے مختلف افسانوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ افسانوں کے بیشتر موضوعات سماجی ہیں۔ حسن کامشاد کی رائے میں

> "The themes of these stories revolve round a criticism of superstition and of hypocritical clergy; denunciation of the unpleasant aspect of urban life, and an unremitting sypathy for the masses who suffersocial and political disabilities." (Kamshad 1966:125)

جلال کی افسانہ نگاری کا ایک عیب جس کی طرف بعض نقادوں مثلاً محمد علی بہارلو نے بجا طور پر اشارہ کیا ہے وہ موضوع کی ٹریٹمنٹ ہے۔ جلال واحد متکلم میں افسانہ لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں جو عموماً افسانے کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ لیکن افسانہ پڑھتے پڑھتے قاری کو یکدم احساس ہوتا ہے کہ مصنف اور زیرِ نظر افسانے کا مرکزی کردار اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ مصنف اپنے ہی تخلیق کردہ کردار پر حاوی ہو کر ''عقلِ کل'' کا روپ دھار چکا ہے اور موضوع کے مطابق یا اس سے ذرا ہٹ کر بھی اپنے ذاتی خیالات کا ابلاغ کر رہا ہے۔ بیشتر اوقات یہ عمل اشاروں کنایوں میں ہوتا ہے تاہم اس سے افسانے کا حسن مجروح ہونا لازمی ہے۔ [بہارلو ۱۳۷۷: ۴۴] انسائیکلو پیڈیا ایرانیکا میں جلال آلِ احمد کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی اس خامی کو بڑے متوازن انداز میں بیان کیا گیا ہے:

> "Al-e Ahmad was an uncertain master of fictional character. Indeed, most of his fiction is cast in the form of first person narratives in which the

division between author and protagonist is paper-thin. he appears at his most engaging and persuasive in these works where he can dispense with the need to wear a fictional mask."

(Encyclopedia Iranica: 2012)

ذاتی اظہار رائے کے لئے اخباری مضامین یا کسی خاص موضوع پر بہ دلایل رائے زنی کے لئے تو یہ انداز موزوں ہوسکتا ہے لیکن افسانہ لکھتے ہوئے اس سے احتراز ہی مناسب ہے۔

ناول نگاری

جلال کا پہلا ناول سر گذشت ِ کندو ھا ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا۔اس سے پیشتر چار افسانوی مجموعوں دید و بازدید (۱۹۴۶ء)، از رنجی که می بریم (۱۹۴۷ء)، سه تار (۱۹۴۸ء)اورزن ِ زیادی (۱۹۵۲ء) کی بنیاد پر وہ جدید فارسی افسانے کے حوالے سے ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے۔آنے والے برسوں میں جلال نے ناول نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور اُن کا دوسرا ناول مدیر مدرسه ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا جو اُن کا بہترین ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔۱۹۶۱ء میں جلال کا تیسرا ناول نون و القلم شایع ہوا جسے'' شاہی دور کے خاتمے تک فروخت کی اجازت نہ مل سکی۔'' [اجمل کمال ۲۰۱۳:۲۴۹]

بعض ایرانی اور غیر ایرانی نقادوں کے خیال میں جلال آلِ احمد کے یہ تینوں ناول دراصل طویل افسانے ہیں جو الگ الگ کتابی صورت میں شایع ہونے کے باعث غلط طور پر ناول یا ناولٹ کہلائے۔اُن کی رائے میں، اور یہ رائے کافی حد تک درست بھی ہے کہ، یہ تینوں تحریریں موضوع اور بیان کے حوالے سے جاندار سہی لیکن ناول کی بعض بنیادی خصوصیات مثلاً واقعات کے بیان میں اتار چڑھاؤ، کہانی کی مخصوص بنت اور کرداروں کی نشوونما وغیرہ سے عاری ہونے کی بنا پر انہیں ناول قرار نہیں دیا جا سکتا۔عبدالعلی دستغیب سر گذشت ِ کندو ھا اور مدیر ِمدرسه کے ساتھ جلال کے ایک اور ناول نفرینِ زمین کو بھی شامل کرتے ہوئے انہیں ناول کے بجائے''یادداشت های شاعرانه و ژرف و در همان زمان واقعیِ او ''گردانتے ہیں۔[دستغیب ۱۳۷۱:۱۹۶]

سر گذشتِ کندوها بظاہر شہد کی مکھیوں کی زندگی کا بیان ہے لیکن درحقیقت استعماری طاقتوں کے ہاتھوں تیسری دنیا کے استیصال کی تمثیلی انداز میں خوبصورت پیشکش ہے۔خالی چھتوں

کو دوبارہ استعمال میں لاتے ہوئے مکھیوں کی تعداد میں اضافے سے شہد کی پیداوار، بہ الفاظِ دیگر اپنی ہی آمدنی، میں اضافہ کمند علی بک کا مقصدِ حیات ہے۔ وہ مسجد کے قریب ڈیرہ جما کر سارا دن مونچھوں کو بل دیتے ہوئے حقہ پیتا رہتا ہے جب کہ مکھیاں روز بروز چھتوں میں شہد بھرتی رہتی ہیں۔ بالآخر مسلسل مشقت اور استیصال سے تنگ آ کر اُن کی سوچ میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوتی ہے اور وہ بظاہر حسین مگر استیصالی نظام سے بصد دقت و کوشش چھٹکارا پا کر سبزے اور چشموں سے عبارت اپنے قدرتی ماحول کو پلٹ جاتی ہیں۔

شہد کی مکھیوں کی زندگی، عادات، چھتوں میں شہد کا بننا اور کاروباری مقاصد کے لیے اس کے زیادہ سے زیادہ حصول کے تمام مراحل کا انتہائی باریک بینی سے مشاہدہ کرنے اور اتنی ہی خوبصورتی سے بیان کرنے پر جلال آلِ احمد قابلِ تعریف ہیں مگر اس موضوع پر یورپی ادب میں پہلے سے موجود متعدد بہتر تحریروں سے ناول کے اس حصے کی مشابہت مصنف کی اُن مآخذ سے باخبری کا پتہ دیتی ہے۔ جلال آلِ احمد کی تمام تحریروں کو گہری تنقیدی نظر سے پرکھنے والے ایک معاصر ایرانی نقاد نے بجا طور پر اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ [دستغیب ۱۳۷۱: ۷۲]

مدیرِ مدرسہ کا موضوع اگرچہ سماجی ہے لیکن جلال کی تحریروں میں کسی نہ کسی حوالے سے سیاسی طنز کا در آنا ایک لازمہ ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول قصباتی ماحول میں واقع ایک پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر کی زندگی اور اُس کو پیش آنے والے مسائل کا احوال بیان کرتا ہے تاہم کم آمدنی والے ایک سرکاری ملازم کے طور پر نیم شہری ماحول میں اُس کی زندگی کے معاشرتی اور سماجی پہلوؤں پر بھی بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ عبدالعلی دستغیب اسے ''داستانِ کوتاهی است بی اوج و فرودِ معین!'' قرار دیتے ہیں۔ [دستغیب ۱۳۷۱: ۶۲] یورپی ادب کا وسیع مطالعہ رکھنے والے بعض نقادوں نے جلال آلِ احمد کے اس ناول کو چیخوف کے ''کوٹھڑی نمبر ۶'' اور کامیو کے ''اجنبی'' سے متاثر قرار دیا جس پر جلال نے اپنے تفصیلی دفاع میں ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ انھوں نے **مدیرِ مدرسہ** لکھتے ہوئے وہ کامیو کے *La Stranger* کے بجائے ایک اور فرانسیسی ادیب L.F. Celline کی کتاب *Voyage au bout de la nuit* (سفر به انتهای شب) سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ [دستغیب ۱۳۷۱: ۶۴۔۶۶] چند تکنیکی خامیوں کے باوجود دلچسپ طرزِ بیان کی بنیاد پر یہ ناول قاری کو اپنی گرفت میں لئے رکھتا ہے۔

جلال کا تیسرا ناول نون والقلم کئی حوالوں سے اہم ہے۔ جدید فارسی ادب میں تمثیلی اندازِ بیان کی یہ شاہکار تحریر ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے پنج تنتر ، کلیله و دمنه، رسالة الطیر اور صفیر سیمرغ جب کہ زبان و بیان کے اعتبار سے نثر نویسی کے جدید انداز سے جڑی ہوئی ہے۔ دستغیب کے الفاظ میں:

> ''نثر آل احمد شسته و رفته و راستهٔ حسینی است. بهره گیریِ او از منابع زبان عامیانه و شعری رگه های درخشانی به نثرش می بخشد، این کار در کتاب 'نون والقلم' ،'مدیر مدرسه'و 'نفرین زمین' بهتر از کار های دیگرش تعهد شده است. توصیف های 'نون والقلم' رسا ست و زنده و محیط و روحِ ایرانی بر سطور کتابش جاری است.'' [دستغیب ۱۳۷۱ : ۸۳]
>
> ترجمہ: ''آل احمد کی نثر دھلی دھلائی اور نکھری ہوئی ہے۔ بول چال کی زبان پر (برمحل) اشعار کے تڑکے نے اُس کی نثر کو عجیب رعنائی بخش دی ہے۔ بقیہ کتب کی نسبت یہ خوبی اُس کے ناولوں 'نون والقلم' ،'مدیر مدرسہ'اور 'نفرین زمین' میں بڑی حد تک نمایاں ہے۔ بالخصوص نون والقلم میں تو یہ خوبیاں بڑی وضاحت سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ایرانی ماحول اور ثقافت کی روح اس کی ہر سطر سے عیاں ہے۔''

قدیم تمثیلی داستانوں کے تتبع میں لکھی گئی جلال کی یہ تحریر ''پیش درآمد''، ''ہفت مجلس''، ''پس دستک'' اور ''پی گفتار'' کے عناوین سے موسوم چار حصوں پر مشتمل ہے۔ بظاہر نون والقلم قرآن مجید کی ایک سورہ کا نام ہے لیکن تہران کے مقامی لہجے میں ''نون'' لفظِ ''نان'' کا مستعمل تلفظ ہے۔ ایک عرضی نویس کو ناول کا مرکزی کردار بناتے ہوئے جلال نے قلم کی حرمت کے فلسفے پر روشنی ڈالی ہے نیز سماجی و سیاسی جدوجہد کے حوالے سے اپنے نظریات کو بھی داستان کا حصہ بنایا ہے۔ حکومت کی عوام دشمن پالیسیوں سے تنگ آئے ہوئے عوام میں سے قلندروں کا ایک گروہ منظم انداز میں جدوجہد کرتے ہوئے حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے۔ بادشاہ تخت و تاج چھوڑ کر دارالحکومت سے فرار ہو کر اپنی ہی مملکت کے سرحدی علاقوں میں جا چھپتا ہے اور کچھ عرصہ بعد ہمسایہ ملک کی مدد سے مسلح کارروائی کے نتیجے میں اقتدار پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد مخالفین کو نکال باہر کرتا ہے۔ انھیں عبرتناک سزائیں دی

جاتی ہیں جس سے عوام میں خوف و ہراس پھیلتا ہے تاہم وہ قلندروں کی چند ماہ پر محیط حکومت کے دور کو یاد کرتے ہیں جو انصاف اور روزگار کی دستیابی سے عبارت تھا۔

موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو پہلوی حکومت کے دورِ عروج میں ایسی تحریر پر پابندی لگنا بعید از فہم نہیں تاہم درج بالا حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ''ایرانی ماحول اور ثقافت کی روح اس کی ہر سطر سے عیاں ہے۔'' ـــــ نون والقلم سے جلال کی خوبصورت نثر کا ایک نمونہ یہاں درج کرنا برمحل ہوگا:

''خانۂ ایشان دو اطاق داشت با یک حوض و یک باغچۂ کوچولو هم داشتندبه اندازۂ یک کف دست که بچه ها توش لاله عباسی کاشته بودند، و خود شان آبش هم می دادند. توی حوض شان هم پنج تا ماهی گلی گلی صبح تا شام دنبال هم می کردند. یکی از اطاق هاشان را با دو تا غالیچه ترکمنی فرش کرده بودند، و یک جفت لاله سر طاقچه اش گذاشته بودند ، و اطاق دیگر با زیلو فرش شده بود و دو دست رختخواب بالای اطاق بود و سر طاقچه ها هم سر کاسۂ بشقاب مسی و چینی شان را چیده بودند یا ازین جور خرت و خورت های زندگی. یک دانه یخدان هم گذاشته بودند گوشۂ پهن اطاق که لباس هاشان را توش می گذاشتند.'' [دستغیب ۱۳۷۱ : ۸۳]

ترجمہ: ''اُن کے گھر میں دو ہی کمرے تھے۔ ایک حوض اور بالشت بھر باغیچہ بھی تھا جس میں بچوں نے گلِ عباسی کا بوٹا لگایا ہوا تھا اور اُسے پانی بھی دیا کرتے تھے۔ حوض میں چار پانچ مچھلیاں صبح سے رات تک ایک دوسری کے پیچھے تیرتی رہتیں۔ ایک کمرے میں ترکمنی قالین بچھا تھا اور طاقچے پر لالہ کے دو پھول دھرے تھے۔ دوسرے کمرے میں دری بچھی تھی اور دو چار پائیاں پڑی تھیں۔ طاقچوں پر تام چینی کی پلیٹیں یا اسی قسم کے برتن وغیرہ پڑے تھے۔ کمرے کے کونے میں ایک آئس بکس بھی تھا جس میں وہ اپنے کپڑے وغیرہ رکھتے تھے۔''

جلال کا چوتھا اور آخری ناول نفرین زمین ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا جو شاہِ ایران کی طرف

سے ''انقلابِ سفید'' کے تحت کی گئی زرعی اصلاحات پر عمدہ تنقید ہے۔

جلال آلِ احمد بطور مترجم

حیرت کی بات ہے کہ بطور سماجی نقاد اپنی منفرد رائے اور بطور افسانہ نگار جداگانہ اسلوب رکھنے والے جلال آلِ احمد نے فرانسیسی زبان سے بیشتر تراجم کسی نہ کسی ساتھی ادیب کے ساتھ بطور شریک مترجم کئے۔ایک معاصر ایرانی نقاد کی رائے میں جلال نے تراجم کے لئے متون کا انتخاب بڑا سوچ سمجھ کر کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف یہ متون جلال کے ذہن میں موجود کچھ سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسری جانب ان فرانسیسی ادیبوں سے جلال کی فکری ہم آہنگی کا پتہ دیتے ہیں۔[دستغیب ۱۳۷۱: ۲۳۲] فرانسیسی زبان سے فارسی میں ترجمہ کرتے ہوئے جلال کے شریک مترجمین میں اُن کی اہلیہ سیمین دانشور کے علاوہ ادب اور سیاست کے میدانوں میں اُن کے متعدد رفقا مثلاً پرویز داریوش (۱۹۲۲۔۱۹۹۰ء)، منوچہر ہزارخانی اور علی اصغر خبرہ زادہ کے نام شامل ہیں۔

عبدالعلی دستغیب کی رائے میں **عبور از خط** کے علاوہ، جس کا جرمن زبان سے ترجمہ دکتر محمود ھومن نے کیا اور جلال نے محض اسے کاغذ پر منتقل کرنے کی خدمت سرانجام دی، جلال کا کوئی ترجمہ ''**ممتازی ندارد و خالی از خطا نیست!**'' محترم نقاد نے البرکامیو کے L' Etranger اور Le' Malentendu، دوستووسکی (Igrok (The Gambler، ژاں پال سارتر کے Les Main Sales اور آندرے ژید کے Retour de l' URSS اور Les Nouritures Terrestres وغیرہ سے متعدد جملے اور مکالمے ہمراہ اصل فرانسیسی متن درج کرتے ہوئے اُن میں موجود بعض نقائص کی نشاندہی کی ہے۔ اُن کی رائے میں دیگر مترجمین کے اشتراک سے کئے گئے یہ تراجم فارسی زبان کے دوسرے نامور مترجمین مثلاً محمد قاضی (۱۹۳۱۔۱۹۹۷ء)، ابوالحسن نجفی (پیدایش: ۱۹۲۹ء)، م.ا.ب. آذین (۱۹۵۱۔۲۰۰۶ء)، مسعود فرزاد (۱۹۰۶۔۱۹۸۱ء)، سعید نفیسی (۱۸۹۵۔۱۹۶۶ء)، پرویز داریوش (۱۹۲۲۔۱۹۹۰ء)، سیروس ذکا (پیدایش: ۱۹۲۶ء)، ابراہیم یونسی اور منوچہر امیری کے تراجم سے قابلِ موازنہ بھی نہیں۔ تاہم اس کی وجہ تلاش کرتے ہوئے وہ مجلّہ ''جہانِ نو'' کو دیے گئے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہیں جس میں جلال نے کہا تھا کہ وہ ۱۹۴۷ء کے بعد فرانسیسی زبان سیکھنے کی غرض سے بعض تراجم بھی کرتے رہے ہیں۔

[دستغیب ۱۳۷۱: ۲۳۳]

جلال بطور سفر نامہ نگار

جلال آلِ احمد نے اپنی مختصر سی پر آشوب، ہنگامہ خیز اور ہر لحظہ مصروف زندگی میں عراق (۱۹۴۲ء)، فرانس و انگلستان (۱۹۵۷ء)، یورپ (۱۹۶۲ء)، اسرائیل (۱۹۶۲ء)، حج بیت اللہ (۱۹۶۴ء)، روس (۱۹۶۴ء) اور امریکہ (۱۹۶۵ء) کا سفر کیا۔ اُن کے چھوٹے بھائی شمس آل احمد راوی ہیں کہ جلال اپنی سفری یادداشتوں کو نظر ثانی یا بازنویسی کے بغیر اشاعت کے لئے نہیں بھجواتے تھے۔[شمس ۱۳۶۹: ۴۶۰] چنانچہ حج اور اسرائیل کے سفر نامے تو بالترتیب ۱۹۶۶ء اور ۱۹۸۴ء میں شایع ہو گئے لیکن بقیہ کی سفری یادداشتیں ہنوز نامکمل صورت میں اشاعت کی منتظر ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ جلال اپنے تمام سفر ناموں کو ایک ہی جلد میں ''چہار کعبہ'' کے عنوان سے شایع کروانا چاہتے تھے جن کی امکانی ترتیب یوں تھی:

کعبۂ نخست: زیارتگاہِ مسلمانان

کعبۂ دوم: زیارتگاہِ مشترکِ مسلمانان، مسیحیان و یہود

کعبۂ سوم: یورپ و آمریکا

کعبۂ چہارم: سوویت روس

اگرچہ جلال کے سفر نامۂ امریکہ کے کچھ حصے اُن کی زندگی ہی میں مجلّہ ''جہانِ نو'' اور اُن کے اپنے مجموعۂ مقالات **کارنامۂ سہ سالہ** میں شایع ہوئے تاہم ناگہانی موت کے باعث انھیں سفری یادداشتوں پر مکمل نظر ثانی کی مہلت نہ مل سکی۔ اسی طرح سفر نامۂ روس کا کچھ حصہ مجلّہ ''بارو'' میں شایع ہوا لیکن بادی النظر میں جلال کی اسی تحریر کے باعث اُس مجلّے پر ہی پابندی لگ گئی۔ ۱۹۹۰ء میں جلال پر لکھی گئی کتاب **از چشمِ برادر** کی تألیف تک شمس آلِ احمد یہ سفر نامہ اِسی صورت میں شایع کروانے کی سعی کر رہے تھے۔[شمس ۱۳۶۹: ۴۶۰-۴۶۱]

سفر نامہ نگاری میں جلال کا اسلوب روایتی سفر نامہ نگاری سے بالکل جداگانہ اور منفرد ہے جسے تحریری کے بجائے مکالماتی کہنا مناسب ہوگا۔ پیش آمدہ منظر کی تیزی سے کی گئی تصویر کشی یا دل و دماغ پر گزرنے والی کیفیت کا مختصر اور بریدہ جملوں میں بیان اِن سفر ناموں کا خاصہ ہے۔ عبدالعلی دستغیب نے جلال کے سفر نامۂ حج **خسی در میقات** کا گیارہویں صدی میں لکھے جانے والے **سفر نامۂ ناصر خسرو** سے موازنہ کرتے ہوئے دلچسپ اندازے قائم کئے ہیں۔[دستغیب ۱۳۷۱: ۱۶۹-۱۷۱] اس ضمن میں مزید مطالعہ مذہبی، تاریخی اور ادبی پہلوؤں سے بڑا مفید ہو سکتا ہے۔

خطوط نویسی

جلال آلِ احمد کی تہ دار اور متنوع ادبی شخصیت کا ایک پہلو جس کی طرف ابھی تک بہت کم توجہ دی گئی، اُن کی خطوط نویسی ہے۔ زود نویس تو وہ تھے ہی، لیکن تخلیقِ ادب کے ساتھ ساتھ اپنے احباب سے بذریعہ خطوط مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ یاد رہے کہ جلال کی وفات (۱۹۶۹ء) تک دنیا ای میل اور ایس ایم ایس جیسے سریع وسائلِ رابطہ سے آشنا نہیں ہوئی تھی، البتہ بیشتر ممالک میں ڈاک کے عمدہ نظام نے خطوط کی بروقت ترسیل کے ذریعے عوام الناس کے درمیان مسلسل رابطے کو ممکن بنایا ہوا تھا۔ اول اول سیاسی سرگرمیوں میں رات دن مصروفیت اور بعد ازاں اندرون و بیرون ملک اسفار کے دوران خطوط ہی وہ واحد ذریعہ تھے جن کے ذریعے جلال اپنے ہمعصر ادیبوں سے رابطے میں رہتے تھے۔ اُن کے اہم مکتوب الیہان میں نیما یوشیج (۱۸۹۵۔۱۹۵۹ء)، صادق ہدایت (۱۹۰۳۔۱۹۵۱ء)، سید محمد علی جمالزادہ (۱۸۹۲۔۱۹۹۷ء)، احمد شاملو (۱۹۲۵۔۲۰۰۰ء)، علی اصغر خبرہ زادہ اور امیر پیش داد وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اشخاص کے علاوہ ادبی و اشاعتی اداروں نیز مدیرانِ جرائد کے نام خطوط کو بھی علی دہباشی نے نامه های جلال آلِ احمد کے عنوان سے مرتب کرنا شروع کیا جس کی پہلی جلد ۱۹۸۹ء میں سامنے آئی۔ [دہباشی: ۱۳۶۸]

مذکورہ بالا کتاب میں شامل مرتب کے تفصیلی مقدمہ میں خطوط نویسی کے حوالے سے جلال کی زندگی کے چند مزید اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اپنی ادبی تحریر دوستوں کو دکھائے بغیر اشاعت کے لئے نہ بھجوانے یا سفری یادداشتوں کو بغیر نظر ثانی شایع نہ کروانے والے جلال آلِ احمد، خط لکھنے کے بعد دوبارہ پڑھا نہیں کرتے تھے! لہٰذا یہ قلم برداشتہ تحریریں اُن کا مافی الضمیر انتہائی سادہ اور فطری انداز میں بیان کرتی ہیں۔ علی دہباشی کے الفاظ میں

> " اعتقاد من این است که نامه نویسی یکی از شاخه های موفق استعداد و هنر نویسندگی جلال است . تفاوتی که در نامه ها و کتاب های جلال موجود است ازین واقعیت ریشه می گیرد که جلال در نامه ها 'خود جوش' است و به همان شیرینی و روانی که صحبت می کند ، نامه می نویسد و. جز در موارد استثنایی . نامه ها را 'از نو نمی خواند' و 'حک و اصلاح 'و 'جرح و تعدیل' نمی کند . و به همین

دلیل ، نامه های جلال آیینهٔ صاف و زلالی است که 'روحیهٔ' او را به خوبی می نمایاند . دیگر اینکه جلال هر گز تصور نمی کرد 'نامه هایش' روزی جمع آوری و مستقلاً طبع و نشر گردد. بهمین جهت آزادانه (و نه با وسواس) نامه ها را نوشته و پراکنده است . ''[دہباشی ۱۹:۱۳۶۸]

ترجمہ: ''مجھے یقین ہے کہ خطوط نویسی ، بطور مصنف ، جلال کی بہترین صلاحیتوں میں سے ایک ہے۔ اس کے خطوط اور دیگر تحریروں کے درمیان موجود فرق کی وجہ بھی یہی ہے کہ خط لکھتے ہوئے جلال اپنے 'فطری جوش' میں آیا ہوا ہوتا ہے اور اُسی شیرینی اور روانی سے خط لکھتا ہے جو اس کی گفتگو کا خاصہ ہے ، نیز چند استثنائی موقع کے علاوہ جلال اپنا خط دوبارہ پڑھنے ، عبارت میں ترمیم واصلاح یا وضاحتوں وغیرہ سے گریز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلال کے خطوط ایسا صاف وشفاف آئینہ ہیں جس میں اس کی اصل شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ اور ہاں یہ ذکر بھی کردوں کہ جلال نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس کے خطوط با قاعدہ مرتب ہوکر کتابی صورت میں بھی شایع ہوں گے۔ اسی لئے اُس نے مکمل آزادی سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کسی جھجک کے بغیر یہ سب خطوط لکھے ہیں۔''

ہمہ وقت ادبی وسیاسی ہنگاموں میں شخصی یا قلمی طور پر متحرک اور فعال رہنے والے جلال آل احمد نے خطوط نویسی میں ''کھلا خط'' لکھنے کی روایت کو بھی آگے بڑھایا نیز کوئی خط ایک سے زیادہ افراد کو مخاطب کر کے شروع کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی خط مختلف لوگوں کو لکھ کر اُن سے الگ الگ جواب کے خواہشمند ہیں۔

جلال آل احمد کے اب تک دستیاب خطوط سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ عبارت آرائی ، رسمی جملوں یا غیر ضروری طولِ کلام کے بجائے اُن کا زور مختصر ترین وقت اور کم ترین الفاظ میں اظہارِ مطلب پر رہتا تھا۔ ذہن میں خیالات کی رَو اس قدر تیز تھی کہ قلم اس کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا لہٰذا بیشتر اوقات وہ مختصر جملے یا فقط اشارات درج کر کے ''الخ . . . '' لکھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایسی متعدد مثالوں کے پیشِ نظر مرتب یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہیں کہ

''صراحت و صداقت و بی پروایی و شجاعت در نامه های

جلال موج می زند۔'' [دہباشی ۱۹:۱۳۶۸]

بیشتر خطوط کا لہجہ سنجیدہ اور غالب موضوعات ادبی ہیں تاہم بے تکلف دوستوں کو قلم برداشتہ خط لکھتے ہوئے چٹکی لینا بعید از فہم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیما یوشیج کے نام خط کا آغاز ''دوست ِ پیر شده ام آقای نیما !'' اور علی اصغر خبرہ زادہ کے نام خط کا آغاز ''الا ای خبرۂ لامس سب صاحاب و ای شیخ نطر بوق پدر سگ صاحاب !'' سے ہوتا ہے۔ اسی طرح شاہ ایران کی سیاسی و اقتصادی پالیسیوں کو طنز و تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اُسے ''گوسالۂ سامری'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ [دہباشی ۲۰۹:۱۳۶۸]

جلال آل احمد کے یہ خطوط ان کی شخصیت اور ادبی و سیاسی نظریات کی تفہیم کے لئے قارئین پر ایک نیا در یچہ وا کرتے ہیں۔ **نامه های جلال آل احمد** کا کوئی بھی صفحہ کھولیں، بیان کی روانی فوری طور پر اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب نگار قاری کے سامنے بیٹھا اپنے مخصوص انداز میں براہ راست اُس سے مخاطب ہو کر یہ تحریر پڑھ کر سنا رہا ہے۔ خطوط کے مندرجات ہر مکتوب نگار کے لحاظ سے مختلف سہی لیکن انداز تحریر کم و بیش ایک سا ہے۔

مقالہ نویسی / جلال بطور سماجی نقاد

افسانہ، ناول اور ترجمہ وغیرہ کے علاوہ جلال نے عمومی دلچسپی کے موضوعات پر درجنوں مختصر اور طویل مقالے قلمبند کئے جو مختلف رسائل و اخبارات میں شایع ہونے کے بعد سات مجموعہ ہائے مقالات بعنوان **هفت مقاله ، سه مقالۂ دیگر ، غرب زدگی، کارنامه ٔ سه ساله ، ارزیابی شتابزده ، یک چاه و دو چاله** اور **در خدمت و خیانت ِ روشنفکران** کی صورت میں منظر عام پر آئے۔ اس موقع پر یہ بات خصوصیت سے قابل ِ ذکر ہے کہ حکومت ِ وقت پر کڑی تنقید کے حامل اِن میں اکثر مقالات مختلف اوقات میں متعدد مجلّات و اخبارات پر طرح طرح کی پابندیوں کا باعث بنتے رہے۔ نیز اسی پر موقوف نہیں، اِن کی کتابی صورت میں اشاعت کی راہ بھی مسدود کی جاتی رہی۔ چنانچہ **در خدمت و خیانت ِ روشنفکران ، یک چاه و دو چاله** اور **غرب زدگی** کے مکمل متون جلال کی وفات کے بعد ہی شایع ہو سکے۔

صرف سینتیس برس کی عمر میں اپنے زمانے کی سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی اقدار پر ناقدانہ لیکن مدلل انداز میں رائے زنی کرنے والے جلال آلِ احمد کا یہ دعوی بلا جواز نہیں کہ

''من تقاضای سن خودم را گمان می کنم بر آورده ام و نیز گمان می کنم جواب ِمسایل ِنسل و دوران ِخودم را داده ام و گر چه این جواب حتی به صورتِ فریادی در چاهی هم نبوده است!'' [دہباشی ۸۱:۱۳۶۸]

ترجمہ: ''میرا خیال ہے میں نے اپنے عہد کے تقاضوں کو جان لیا ہے اور اپنی نسل اور زمانے کو درپیش سوالات کا جواب بھی دے دیا ہے، اگر چہ میری صدا کنویں سے آنے والی آواز سے کچھ زیادہ نہیں ہے!''

سرزمین ایران سے عشق جلال کا جزوِ ایمان تھی۔ ایرانی معاشرے میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی مغرب پرستی کے خلاف تحریری و زبانی جہاد بھی اسی کا نتیجہ تھا۔ وہ زندگی کے تمام شعبوں سے مغربیت کے انخلا کو ضروری گردانتے تھے۔ ایک سوانح نگار کے بقول وہ یورپی طریقۂ علاج اور اس کی دواؤں کے استعمال کے بجائے مقامی طریقہ ہائے علاج

اپنانے کو ترجیح دیتے تھے اور انھوں نے اپنے تئیں بھرپور کوشش کی کہ حکومتِ وقت مغربی طرز کے میڈیکل کالج کھولنے کے ساتھ ساتھ روایتی طریقہ ہائے علاج کی جدید انداز میں تدریس کے لئے بھی ادارے قائم کرے تاکہ ہزاروں سال سے آزمودہ نسخے اور دوائیں محفوظ ہو جائیں مگر اُن کی یہ تجاویز ''رموزِ مملکت'' کی نذر ہوگئیں۔ [صافی ۱۳۶۴: ۶۷۔۶۸]

جلال کے تحریر کردہ اِن مقالات کے موضوع بہت متنوع ہیں۔ حکومتی پالیسیاں، سیاست کی نیرنگیاں، سماجی و معاشرتی اقدار میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، ادبی تحریکیں، تعلیمی اصلاحات غرضیکہ ایرانی عوام کی زندگی سے منسلک ہر پہلو پر مقالات اِن مجموعوں میں شامل ہیں۔ طنز کی کاٹ نے اگر چہ اکثر مقامات پر لہجے کو تند و تیز کر دیا ہے تاہم ان کی سطر سطر سے مؤلف کا خلوص عیاں ہے۔

عمومی یا مشاہداتی مضامین

۱۹۶۰ء کی دہائی تک اندرون ملک دیہی یا دیگر دور افتادہ مقامات کے اسفار کو ''سفرنامہ'' کے عنوان سے پیش کرنے کا رواج جدید فارسی نثر میں رواج نہیں پا سکا تھا لہٰذا ایران کے طول و عرض میں جلال کی سفری یادداشتوں کو مؤرخین ادب نے مشاہداتی مضامین کی ذیل میں رکھا ہے۔ اس حوالے سے اُن کی تین تحریریں اہم ہیں۔

اورازان (آب + ریزان) شمال مشرقی تہران میں ایک گاؤں ہے جہاں جلال آلِ احمد

کے اجداد مدتوں سے رہتے آئے تھے۔ جلال کے چھوٹے بھائی شمس آل احمد کے بقول جلال دو تین برس تک اس تذبذب میں رہے کہ تقریباً سو صفحات پر مشتمل اس تحریر کو سوانح، سفرنامہ یا مشاہداتی مضمون، کس عنوان سے طبع کروائیں۔ بالآخر انھوں نے مغربی صنفِ نثر ''مونوگراف'' کے مقابلے میں ''تک نگاری'' کی اصطلاح وضع کی اور اسے ۱۹۵۴ء میں شایع کیا۔[شمس ۱۳۶۹: ۲۵۴]

تات نشین های بلوک زهرا نامی مونوگراف قزوین کے جنوب میں واقع ایک پسماندہ علاقے میں رہنے والے عوام کی حالتِ زار کا نوحہ ہے۔ اور ازان کی نسبت اس کی زبان اور اسلوب پختہ تر ہے۔ نیز اس کی اشاعت کے بعد فارسی میں مونوگراف لکھنے یا ''تک نگاری'' کا رواج عام ہوا۔

مشاہداتی نوعیت کی تیسری تحریر **جزیرۂ خارک . در یتیمِ خلیج** ہے جو انھوں نے اپنے دوست ابراہیم گلستان کی فرمایش پر سپردِ قلم کی۔ شمس آلِ احمد کے بقول جلال کی یہ تحریر درحقیقت اُس فلم کا منظرنامہ یا بنیادی خیال ہے جو ابراہیم گلستان تیل کی دولت سے مالا مال اس ایرانی علاقے پر بنانا چاہتے تھے۔[شمس ۱۹۶۹: ۲۵۸]

تراجم

جلال کی حینِ حیات میں ان کی بہت کم تحریریں دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ اردو میں بھی اکا دکا افسانے ہی ترجمہ ہوئے تاہم ۱۹۸۰ء کے بعد اس سلسلے میں کافی تیزی آئی۔ چنانچہ امریکہ اور یورپ میں مقیم ادب دوست ایرانیوں نے انگریزی زبان میں لکھنے والے ادیبوں کے تعاون سے جلال کی متعدد تحریریں ترجمہ کیں جن کے کافی ایڈیشنز شایع ہو چکے ہیں۔ اردو میں ایک سے زاید بار ترجمہ ہونے والے افسانوں مثلاً **سه تار** اور **بچۂ مردم** کی طرح غرب زدگی کا انگریزی ترجمہ بھی Weststruckness اور Occidentosis کے عناوین سے دو مرتبہ ہو چکا ہے۔

جلال آل احمد ادبی ایوارڈ کا اجرا

حکومت ایران نے جلال آل احمد کے ادبی مقام و مرتبے کا اعتراف کرتے ہوئے ۲۰۰۸ء میں ''جلال آل احمد ادبی ایوارڈ'' کا اجرا کیا جو ہر سال چار شعبوں ناول، افسانہ، ادبی تنقید اور غیر افسانوی نثری ادب میں شایع شدہ بہترین کتب پر دیا جاتا ہے۔

جلال آل احمد کے فکر و فن کا یہ سرسری جائزہ اس امر کا شاہد ہے کہ بیسویں صدی میں جدید ایرانی ادب کی اس اہم اور قد آور شخصیت کے حوالے سے مزید تحقیق و تفحص اور تحلیل و تجزیہ کی گنجایش بہرحال موجود ہے۔ ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالہ!

حواشی

۱۔ جمال زادہ کے ہاں اگر چہ عوامی محاوروں اور روز مرہ کے استعمال کسی قدر مشکل پسندی بھی ملتی ہے تاہم یہ ایک انفرادی مسئلہ ہے۔

۲۔ جلال آل احمد امام محمد باقر کی نسل سے ہیں۔ان کے والد شیخ احمد، بڑے بھائی محمد تقی اور دو برادر نسبتی بھی مذہبی عالم تھے۔علاوہ ازیں بیسویں صدی کے معروف عالم دین آیت اللہ سید احمد طالقانی (وفات ۱۹۷۹ء) بھی رشتے میں جلال کے چچا لگتے تھے۔

۳۔ ناصرالدین شاہ قاچار (دور حکومت: ۱۸۴۸ تا ۱۸۹۶ء) کے عہد میں امیر کبیر (۱۸۰۷۔۱۸۵۱ء) کی کوششوں سے قایم ہونے والا جدید مدرسہ جہاں ایران کی تاریخ میں پہلی بار مختلف علوم وفنون کی یورپی طرز پر تعلیم وتربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔ایک رائے کے مطابق بیسویں صدی میں قایم ہونے والی ایران کی تمام جدید یونیورسٹیوں نے خیابان ناصر خسرو پر قایم اسی مدرسے کی کوکھ سے جنم لیا۔

۴۔ ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری (۱۹۱۹۔۱۹۹۰ء) کی زیر ادارت ۱۹۴۰ء میں آغاز ہونے والا ادبی مجلّہ ''سخن'' معاصر ایرانی ادب کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔بیسویں صدی کے متعدد بڑے ایرانی ادیبوں کی تخلیقی زندگی کی ابتدا اسی ادبی پلیٹ فارم سے ہوئی۔

۵۔ سیمین دانشور (۱۹۲۳۔۲۰۱۲ء) معاصر ایرانی ادب کا ایک معتبر نام ہے۔انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور مترجم اور صحافی کیا اور ساتھ ہی ادبی میدان میں بھی بطور افسانہ نویس قدم رکھا۔ ۱۹۴۸ء میں شایع ہونے والا ان کا افسانوی مجموعہ آتش خاموش فارسی زبان میں کسی خاتون کی لکھی ہوئی کہانیوں کا سب سے پہلا مجموعہ ہے۔انھوں نے ۱۹۵۰ء میں جلال آل احمد سے شادی کے بعد ۱۹۵۲ء میں فل برائٹ سکالر کے طور پر دو سال امریکہ کی سٹانفورڈ یونیورسٹی میں گزارے۔۱۹۶۹ء میں شایع ہونے والا ان کا ناول سووشون جدید فارسی ادب کے اہم ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔آپ کی دیگر کتب میں افسانوی مجموعے شهری چون بهشت، به کی سلام کنم اور ناول جزیرهٔ سرگردانی شامل ہیں۔

۶۔ خلیل ملکی (۱۹۰۱۔۱۹۶۹ء) بیسویں صدی میں ایرانی سیاست کا ایک بڑا نام ہے۔آپ تبریز میں پیدا ہوئے اور ہائی سکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد کیمیکل انجینیرنگ کے شعبے میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی چلے گئے جہاں مہدی بازرگان (۱۹۰۸۔۱۹۹۵ء) اور کریم سنجابی (۱۹۰۴۔۱۹۹۵ء) سے دوستی ہوئی۔خلیل ملکی ان ترپین (۵۳) سیاسی دانشوروں میں شامل تھے جنھوں نے

ایک اصولی مؤقف اپناتے ہوئے ''حزب تودہ'' سے علیحدگی اختیار کی اور بعدازاں ''جبہہ ملی'' (نیشنل فرنٹ) کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر مصدق سے اختلافات کے باوجود خلیل ملکی نے ''نہضت ملی شدن نفت'' (تیل کی صنعت قومیانے کی تحریک) میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ بعدازاں شاہ ایران کے دور میں ''حزب سوسیالیست'' (سوشیالسٹ پارٹی) کی طرف فعال سیاسی کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۳ء میں وی آنا چلے گئے جہاں ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں صحت مزید خراب ہوگئی۔ وطن واپسی پر برطانیہ کی لیبر پارٹی کے ایک رکن سے ملاقات کی پاداش میں تین برس کے لیے قید کر دیے گئے مگر ڈیڑھ برس بعد ہی رہا ہو کر ایک بار پھر میدان سیاست میں سرگرم ہوئے اور ۱۹۶۹ء میں وفات پائی۔

مآخذ (الفبائی ترتیب سے)

اردو:

- اجمل کمال، آج، کراچی ۲۰۱۳ء
- مختار مسعود، لوح ایام، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور ۲۰۱۱ء

فارسی:

- آل احمد، شمس، از چشمِ برادر، انتشاراتِ کتابِ سعدی، قم ۱۳۶۹ھ.ش
- بہارلو، محمد، داستانِ کوتاہ ایران، انتشاراتِ طرحِ نو، خرمشہر ۱۳۷۷ھ.ش
- دستغیب، عبدالعلی، نقد آثارِ جلال آلِ احمد، نشرژرف، تہران ۱۳۷۱ھ.ش
- دہباشی، علی، نامہ ہایِ جلال آلِ احمد، انتشاراتِ بزرگمہر، تہران ۱۳۶۸ھ.ش
- صافی، قاسم، قلمروِ اندیشۂ آلِ احمد، دانشگاہِ تہران ۱۳۶۴ھ.ش

انگریزی:

- Encyclopaedia Irania via internet ()
- Kamshad, Hassan, *Modern Persian Prose Literature*, Cambridge 1966

❁.....❁.....❁